حصہ مشق جاریہ

شام کی دہلیز

سلیم الرحمٰن

مکتبۂ ادبِ جدید لاہور

شام کی دہلیز

سلیم الرحمٰن

مکتبہ ادب جدید

ترتیب

''شام کی دہلیز،، ایک شہری انا کا سفر ہے !

یہ سفر تمام تر ہموار نہیں ، اسلئے کہیں لہجے میں ملائمت ہے تو کہیں تلخی ۔ اس سے مفر نہیں کہ گردو پیش ایک فکری اور جذباتی تشدد کا حامل ہے حساس ذہن ہر وقت شکست و ریخت کے خطرے سے دو چار ہے ۔ یہ خطرہ داخلی اور خارجی دنیا پر اتنی شدت سے حاوی ہے کہ ہر اظہار کے پیرائے پر اسکی مہر ثبت ہے ۔ یہ مہر زدہ تحریریں عکاس ہیں اس خارجی دنیا کی، جہاں قدم قدم پر ہمارے ارادوں اور فیصلوں کیلئے ایک پریشانی مقدر ہے ۔ یہ انتشار غیر منضبط خارجی دنیا کا پرتو ہوتے ہوئے کبھی تو بلا کم و کاست ہمارے شعور میں در آتا ہے اور کبھی ہماری بنی بنائی دنیائے معنی کو توڑ پھوڑ کر انا کا ٹیڑھا میڑھا مرقع ہماری آگہی کو پیش کرتا ہے

ان امور کی تدوین ان نظموں کے موضوعات میں شامل ہے ۔

اس تدوین کا خاکہ وہ شہری زندگی ہے جو اپنی گمبھیرتا کے ساتھ ہمارے گھروں میں آ گئی ہے ۔ انسانی روابط اور ان کے وسیلے سے زندگی کرنے کو شہری بود و باش ایک غیر شخصی تناظر بخشتی ہے ۔ یہ عناصر اجتماعی تہذیبی زندگی کو نہج پر نہیں رہنے دیتے ۔ انسانی روابط کی اجتماعی قبولیت کی جگہ سماجی اور اخلاقی قوانین لے لیتے ہیں ۔ رشتوں کے سلسلے مختصر اور غیر مستحکم ہو جاتے ہیں ۔ اور بے تعلقی کی ہوا سنکنے لگتی ہے ۔ بے تعلقی کا یہ غیر شخصی عنصر ہمیں ایک عظیم تنہائی سے روشناس کراتا ہے ۔ اور ہم فرد کی جامعیت اور اہمیت کے استعاروں سے اپنی دنیا کو معنویت دیتے ہیں ۔

یہ معنویت ایک دریا ہے !

یہ دریا چاروں طرف کی بکھری ، پریشان اور پراگندہ زندگی کو اپنے بہاؤ میں سمیٹ لیتا ہے ۔ شکست و ریخت پھر بھی جاری رہتی ہے کنارے بنتے، ٹوٹتے اور پھر بنتے ہیں۔ لیکن اس سمٹتی ہوئی قوت کے دامن سے باہر ان میں کوئی ایکتا نہیں ، البتہ اندر ایک وحدت ہے ۔ وحدت جو ہر فرد کو فرد رکھتی ہے ، اپنے آپ میں گم ، تنہا تنہا ۔ گویا شہری زندگی جس کی ایک انا ''شام کی دھلیز،، ہے ، سمیز ہے اپنی نا قابل عبور تنہائی، داماندگی اور پریشانی سے یہ سب کچھ موت کا مقام رکھتا ہے ۔

وہ ذہن جس نے اشیاء کا ادراک محض شنید سے کیا ہو اور اپنی حد کو حد آخر سمجھنے پر مصر ہو، اس کرب سے روشناس نہیں ہو سکتا جو اس شدید تنہائی کے زیر سایہ پروان چڑھتا ہے ۔ اسے قبول کرنے کیلئے کشادہ ظرفی اور نئی تہذیبی زندگی پر اعتبار کرتے ہوئے زندہ رہنے کی ہمت چاہئے ۔ بلا اعتبار تو زندگی کا کلی مفہوم کہ سراسر مفروضاتی ہے ، اپنی ہستی کھو دیتا ہے ۔ اس عظیم انسانی مفروضے کی قبولیت سے پیدا شدہ امتحانی کشمکش کو چھوڑ کر محض ذکر محبوب میں مشغول رہنا کچھ پسند نہیں آتا ۔ یہ تو ممکن ہے کہ ان کی بات سنی جائے جو سب کچھ دل کی دھڑکنوں کے روائتی انداز میں دیکھتے دکھاتے ہیں ، لیکن یہ کہ یہی حقیقی جانا جائے اور اس سے سرمو تجاوز نہ کیا جائے بڑی معصوم کوتاہ نظری کی بات ہے ۔ مریں ، مر جائیں پر اتنا تو کہیں کہ زندگی اپنی گہما گہمی کے

کے با وجود دشوار ہے، نہ کہ شب و روز کی تنہائی اور سختی محبوب اور عشقیہ محاورے کی نذر کر دیں۔

روز و شب کی کشا کش ہماری ذہنی دنیا میں جو تغیر لاتی ہے اس کا پرتو ان نظموں میں دکھائی دیتا ہے۔ گاہے امید کی کرن کا قصیدہ ہے تو گاہے نا آسودگی کا مرثیہ۔ لیکن یہ بھی ایک فرق کے ساتھ۔ معنی کے پیکر تراشے گئے ہیں۔ منجملہ دیگر خواص کے پیکر معنی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ موجود کی جانب ذہن کو مبذول کرتے ہوئے غیر موجود سے بھی ہمکنار کرتا ہے۔ یہ عمل، پیکر معنی کے حوالے سے ان تمام حقیقی و غیر حقیقی امکانات، احساسات اور تجربات پر مشتمل ہے جو بیک وقت ذہن کا احاطہ کئے ہوئے ہوں اور پیکر معنی ان کی تجسیم اور تجرید سے فی الواقعہ موجودگی کی حدود سے ماورا لے جائے!

کچھ اقتسابات دیکھئے:

میں ان میں نہیں ہوں جو ہوں گے
میں اپنے سوالوں کی زنجیر میں قید ہوں
اور انکار کے رات دن سے گذرتا ہوں
میرے لئے معجزے اور پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ساری سچائیاں
مردہ نسلوں کی تاریک قبروں پر مٹتی ہوئی تختیاں ہیں
مجھے اپنے اجداد کی ہڈیوں میں کبھی زندہ ہونے کی خواہش نہیں

مجھے اتنا معلوم ہے
میرے اور موت کے درمیان سانس کا ایک لمحہ ہے
اور عمر کا ایک جھونکا
مرے واسطے زندہ رہنے کا کوئی بہانہ نہیں ہے
(سوالوں کی زنجیر)

مرے سامنے ایک پھیلا ہوا جال ہے راستوں کا
قطاریں ہیں ، بجلی کے کھمبوں کی ، اونچے مکانوں کی ،
پیڑوں کی
لیکن کوئی راستہ ، کوئی بھی روشنی
کوئی کھڑکی ، کسی پیڑ کا سایہ ایسا نہیں ہے
جسے دیکھ کر
مہرباں آنکھ کی مسکراہٹ مجھے یاد آئے
(آوارہ)

خون میں لت پت لاش تھی میری اور سینے میں تیر
پتھر کی اونچی دیواریں ، پاؤں میں تھی زنجیر
اُجلے کفن کی چادر پر تھے سرخ گلاب کے پھول
لاکھوں لوگ اور روشنیاں اور قبرستان کی دھول ،
کبھی ہوا کے ہاتھ پر لکھا ہوا تھا میرا نام
اُڑتے ہوئے پتوں کا ماتم ، زرد اور سونی شام

کبھی پیا ہے ہنس ہنس میں نے سارے دکھوں کا زہر
جنگل کی آواز کے کھوج میں چھوڑا ہنستا شہر
اک لمحے میں لاکھ انوکھے روپ لئے مرتا ہوں
وہ جو کہیں نہیں ہے اس کی خواہش بھی کرتا ہوں
(میں اور موت)

کھلی پارکوں میں
درختوں کے چمکیلے پتوں پہ گرتی ہوئی روشنی میں
کبھی چاند کے نیلگوں سائے میں بیٹھ کر
درد کے تیز کانٹے نکالوں گا، چپ چاپ!
بجھتی ہوئی رات کے آخری پہر میں
سونے بستر کی ڈستی ہوئی ناگنوں پر
میں بھوکے بدن کو رلاتا رہوں گا
(شہر اور زنجیر)

یوں "شام کی دہلیز" کے حوالے سے جو شخصیت ہمارے سامنے ابھرتی ہے اس کے خدوخال خاصے واضح ہیں۔ صبح کی نرمی دوپہر کی سختی، بادل ہوا اور بہار اپنے مختلف تلازموں سے ایک پر اسرار دنیا کی تعمیر میں شامل ہیں۔ پھر خوف، لذت اور پریشانی کی تصویریں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔ ان کی موجودگی میں ہم شاعر کی موجودگی دیکھ سکتے ہیں جس نے اپنی ذات سے اس متنوع مواد کو ایک ترتیب اور نظم سے ہمکنار کیا ہے۔

پھر یہی نہیں ، ان تمام عناصر کو دیکھنے کیلئے سلیم الرحمان نے اپنی طویل نظم ''دریا،، میں ایک فکری مقام بھی متعین کیا ھے ۔ واضح رھے کہ موضوعاتی لحاظ سے جس طرح ''دریا،، روائتی نہیں اسی طرح اس کا لہجہ ، آھنگ اور اسلوب بیان بھی غیر روائتی ھے ۔ اندھیری رات میں بپھرے ہوئے دریا کو عبور کرنا ھے۔ ملاح پار لے جانے سے انکار کرتے ہوئے کہتا ھے :

عبداللہ : ایک ھی سانس میں تیز ھوا
دئے کی لو کو بجھا دیتی ھے
شام سے میں نے کتنی بار جلایا ھے
تم میرے انکار سے کچھ مغموم دکھائی دیتے ھو
اکبر : ھاں میرا جانا بہت ضروری ھے
عبداللہ : جانا بہت ضروری ھے تو
پل پر سے کیوں نہیں جاتے
یہاں سے پار اتر بھی جاؤ
تو میلوں پھیلا جنگل ھے

یہ کیسا انتخاب ھے ؟ سلامتی کا راستہ — پل، موجود ہونے کے با وجود بپھرے ہوئے دریا ھی کو عبور کرنا ھے ۔ جس کے معنی شاید جنگل میں ھمیشہ کیلئے کھو جانے کے ھیں ۔ ایک اذیت ناک ماضی تعاقب میں ھے ۔ گناہ اور تلاش کے ربط باھم سے دریا ، ملاح اور باپ بیٹا ایک علامتی روپ اختیار کر لیتے ھیں ۔ ان کے تصادم سے ھمیں

اپنا چہرہ نظر آنے لگتا ہے ۔ باپ بیٹے کی کشمکش میں ہمیں بہت سی ان کہی صداقتوں سے آگہی ملتی ہے اور ''دریا'' زندگی کا علامیہ بن جاتا ہے : جس کی طرف ہمیں لوٹنا ہے، جو ہمارا مقدر ہے !

عبداللہ : آؤ چلیں
ہم کو دریا اپنی سمت بلاتا ہے
دریا ۔۔۔ دریا
اپنی گود کو پھیلا
ہم آتے ہیں
ہم آتے ہیں
لہرو لہرو
ٹھہرو ٹھہرو
ہم آتے ہیں ۔

داخلی اور خارجی طوفان کو ہم آہنگ کرکے جس ہیجانی سکون تک ہم پہنچتے ہیں کیا وہ حقیقی نہیں ؟

''شام کی دہلیز'' جس شہری انا کا سفر ہے اسکے لئے، تو ہے !

افتخار جالب

لاہور

اگست ۱۹۶۲ء

سوالوں کی زنجیر

بول اے میری کتاب
تیرا چہرہ چومتا ہوں
تیرے ماتھے کے سکوں میں ڈھونڈتا ہوں آج پھر قسمت کا نقش
کھولتا ہوں کانپتے ہاتھوں سے صحراؤں کا دروازہ پرانا
جن کی اجلی ریت میں اگتے ہوئے موتی
ہزاروں چاند تارے آفتاب
مدتوں سے ایک لمحے کے سکوں میں کھو گئے ، ـــــ
ٹھہرے ہوئے ہیں
ایک انگلی کے اشارے کیلئے !
میں مگر اس سانس کی زنجیر میں ہوں
موت کی مٹی مرا یہ جسم ، میں اسکی سزا
کونسے لفظوں پہ رکھوں ہاتھ
جس سے صبح کی تحریر روشن ہو ، مری آنکھیں کھلیں
خوشبو ملے مجھ کو ہوا کی، ـــــ جو پرانے غار میں پیدا ہوئی
کس طرح گزرے یہ میرے دکھ کے موسم کا عذاب
ـــــ بول اے میری کتاب !

ایک کتبہ

یہ مرا المیہ ہے
میں اس وقت اس کھیل میں آ کے شامل ہوا
جب ہر اک شکل
اپنے لہو کی مچلتی ہوئی آگ سے سرخ تھی ،——
آج صدیوں کی سوئی ہوئی نفرتیں جاگ اٹھی ہیں
آنکھیں وہ دوزخ ہیں جن میں
ہر اک شعلہ اک دوسرے سے جدا
رنگ میں آگ میں نقش میں جاگتا ہے
مجھے پہلے دن سے یہاں
اپنے ہاتھوں سے اپنی رگیں کاٹ کر
خون بہانے کی لذت ملی ہے۔
نہیں میرے حصے میں میری بدی آئی ہے
ہمارے رشتوں میں قائم فقط ایک رشتہ رہا ہے
میں اب آنے والی رتوں کی ہری کونپلوں ، کل کے سورج کی
امید میں
شام کے وقت پتے اڑاتی ہواؤں کے ماتم میں شامل نہیں ہوں
میں ان میں نہیں ہوں ، جو ہوں گے

میں اپنے سوالوں کی زنجیر میں قید ہوں
اور انکار کے رات دن سے گزرتا ہوں
میرے لئے معجزے اور پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ساری سچائیاں
مردہ نسلوں کی تاریک قبروں پہ مٹتی ہوئی تختیاں ہیں
مجھے اپنے اجداد کی ہڈیوں میں کبھی زندہ ہونے کی خواھش
نہیں ہے
مجھے اتنا معلوم ہے
میرے اور موت کے درمیاں سانس کا ایک لمحہ ہے،
اور عمر کا ایک جھونکا
مرے واسطے زندہ رہنے کا کوئی بہانہ نہیں ہے!

سانس کی لکیریں

یہ ہوا کا کھیل ہے ،
میں بھی نہیں ، تو بھی نہیں ہے
شام کے رستے پہ اُڑتی دھول کے خاکے ہیں ہم
سانس اُلجھی سی لکیریں ،
رنگ آوازوں کے دیواروں پہ مٹی کے پرانے نقش ہیں
سرد سہ پہروں میں ،
جلدی جلدی چلتی دھوپ کی طرح رواں ہیں
ہونٹ اور یہ ہاتھ سارے بے نشاں ہیں
شام کی دہلیز سے آگے
پرانا سا کوئی گھر ہے ،
میں بھی ہوں ، تو بھی ، جہاں ہے
اس جگہ کوئی نہیں
میں بھی نہیں ، تو بھی نہیں

میں اور میں

وہ اک جھومتی جھامتی شاخ تھی
ریشے ریشے میں رگ رگ میں رس تھا
چمکتا ہوا خون تھا
اس سے وابستہ جیون کی ہر آس تھی ،
میرا دل ایک بے آسرا بیل کی طرح لپٹا رہا ، اور زندہ رہا
اب خزاں کی ہوا نے بڑی دور مجھ کو گرا کر
مجھے زندگی سے جدا کر دیا ہے
——— یہاں خشک بنجر زمین پر پڑا ہوں !

ایک لڑکی

من کی چھوٹی سی دنیا میں آشاؤں کا ایک میلہ سا ہے،
اُس کی نس نس میں اک آگ سی کروٹیں لے رھی ہے
خیالوں میں سپنے سنہرے بسے ھیں،
ذرا کوئی اُس سے پر اتنا تو کہہ دے
کہ اے شوخ لڑکی!
تیرے بالوں میں گجرے کی خوشبو بڑی مست، میٹھی سی ہے
تیرے ھونٹوں پہ امرت کی دھاریں ھیں
تو اپنی آنکھوں میں کاجل سجائے ہوئے کتنی سندر نظر آرھی ہے
وہ سن کے لجائے گی، سمٹے گی
اور پھر ھواؤں کے سرگم پہ متوارے نغمے سنائے گی
جیسے کوئی اُس کے دل کے کناروں کو
چپکے سے چھونے لگا ھو

جھونکا

یہی اک وہ پل تھا
مجھے جب محبت بھری مست آنکھوں نے
موتی گراتے کہا تھا :
ہمیں اپنا ہمدرد جانو
تمہارے لئے سونی راتوں کے سپنوں سے
اٹھ اٹھ کے روئیں گی ،
ہر ایک رت میں تمہارا ہی رستہ تکیں گی
یہی اک وہ پل ہے کہ جس نے
کبھی درد کے تیز کانٹوں میں الجھے ہوئے
آنسوؤں میں ، کبھی بادلوں میں گھرے ، مجھ کو دیکھا
یہی ایک پل ، ایک جھونکا
مجھے میٹھی باتوں کا امرت پلانے کو آیا ہے
دکھتے ہوئے میرے سینے کو
جلتے ہوئے گرم ماتھے کو
اپنے خنک ، مہرباں نرم ہاتھوں سے تھپکا گیا ہے

محبت

کبھی وہ صدا
گنگناتی سبک رو ہواؤں کی آہٹ تھی
دھیرے سے گرتی ہوئی نیند سے چور پلکوں کی لرزش تھی
گنگ اور نیلی فضاؤں میں اُڑتے ہوئے ایک پنچھی کی
مستی بھری پھڑ پھڑاہٹ کا نغمہ،
کلی کے چٹکنے کی آواز تھی۔
اب وہی اک صدا،
گونجتے گونجتے باؤلی رات کی چیخ میں ہے
ہواؤں کی روتی ہوئی بانسری، بادلوں کی گرج
میری رگ رگ سے اٹھتے ہوئے درد کی لے بنی ہے
کبھی میرے ویران سانسوں میں چلتے ہوئے
تیز جھکڑ کی آواز ہے
میری سلگی ہوئی خواہشوں کا امڈتا ہوا شور ہے

ایک لمحہ

یہاں تو اور کچھ نہیں ،
اداس ٹہنیوں کی نرم چھاؤں ہے
حسین پھول اپنی لمبی لمبی گردنیں جھکائے سوچ میں کھڑے ہیں
میں ہوں ، تم ہو اور سونا پن —— !
حنائی آنگلیوں سے میرے بال تم سنوارتی ہو
سوچتا ہوں تم یہاں فقط مرے لئے ہو
مگر جو کل کسی ہجوم میں تمہیں میں دیکھ پاؤں گا
جہاں تمہارے پھول سے لبوں کو، چاندنی سے جسم کو
ہزار لوگ اور بھی تو چاہیں گے ، سراہیں گے
وہاں تم ایک ناز ، اک ادا سے مسکراؤگی ،
غرور کے نشے میں اپنا ہر قدم اٹھاؤگی
مگر مری یہ بے بسی !
کہ ایسے وقت میں ہجوم سے پرے کھڑا رہوں
تمہی کو دیکھتا رہوں !
مگر تمہاری آرزو نہ کر سکوں !

آنکھ اور سایہ

مجھ کو معلوم ہے
جب بھی ویران سی شام آئے گی
اور بادلوں کو اٹھائے ہواؤں کے بوجھل سے دامن اڑیں گے
خموش اور سنسان گلیوں میں
سونے سمے کی اداسی کا جادو بڑھے گا
تو تم اک نیا روپ دھارے ہوئے آؤگی ،
سونی تاریک بارش کی فریاد کا گیت بن جاؤگی ،
اک اندھیرے سے گوشے میں
اک سائے کی آنکھ بن کر ڈراؤگی !

شام

شام ہے
لمبی گلیوں میں اونچے مکانوں کی دیوار پر
پھیلتے سائے ہیں
دور افق پر سیہ رنگ بادل کے پیچھے
سلگتی ہوئی دھوپ ہے
ایسے ہی تیرے جیون کا ڈھلتا ہوا روپ ہے
اس ہوا میں ترے درد کا گیت ہے
ان درختوں کے گرتے ہوئے آنسوؤں میں
کسی اور کا غم نہیں،
ایک تیرے سوا کوئی ماتم نہیں،
ایک لمحے میں یہ جگمگاتے ہوئے شوخ رنگ
اک دھواں بن کے اڑ جانے والے ہیں
ان کی دمکتی کلی بجھنے والی ہے
وہ تیرگی چھانے والی ہے
جب تیرا احساس تجھ سے بچھڑ کے
گھنے اور بے نام جنگل میں کھو جائے گا،
تو یہاں آرزو کی چتا پہ کھڑی روئے گی

بیمار لڑکی

شام کی گنگناتی ھواؤ !
مجھے ساتھ اپنے آڑاتے ھوئے لے چلو
وہ جہاں اونچے اونچے درختوں کی
غم ناک سی چھاؤں ھے ،
چاند تاروں کے رستوں سے آگے مرا گاؤں ھے
میرا گھر —— سونا گھر اپنے بازو بڑھائے
مرا راستہ تک رھا ھے ،
کوئی اجنبی سی صدا میرے کانوں میں آتی ھے
مجھ کو بلاتی ھے —— جانے کہاں
اونچے اونچے درختوں کی غم ناک سی چھاؤں ھے !
اور سرھانے کا یہ ننھا منا دریچہ کئی بار کھلتا رھا ،
جگمگاتی ھوئی روشنی آئی ، موسم بدلتا رھا
چاندنی رات میں پھول کھلتے مگر میں نے دیکھے نہیں
دل میں سہمی ھوئی خواھشوں کے
کبھی ھونٹ ھلتے مگر میں نے دیکھے نہیں
میں نے جب ڈرتے ڈرتے کبھی آنکھ کھولی
مرے چاروں جانب دھند لکا سا تھا !

میں نے چپکے سے جب بھی کبھی سانس لی
میری رگ رگ میں سمٹا ہوا میرا دکھ کم نہیں ہو سکا
میں نے نیلے خلاؤں میں آڑتے ہوئے پنچھیوں کو صدا دی
مگر میرا کوئی نہ تھا !
آج بھی میرا کوئی نہیں ،
ڈولتی سانس آئے گی البیلی دلہن کی طرح اچاتی
یہ پھول اور خوشبو مرے راستے کے ہیں ساتھی ،
ستارے ہیں روتے ہوئے ننھے ننھے براتی
مرے واسطے اب جدائی کی فریاد کا گیت گاؤ ـــ
ـــــ ہواؤ !

دل اور آنکھیں

یہ دروازہ کھلا آخر رہے کب تک ؟
ھوا آتی ھے دھیرے سے
ملن کے مست لمحوں کی چرا لاتی ھے البیلی سی خوشبوئیں
کسی کے سانس میں الجھی ھوئی بے نام سی خواھش کی سرگوشی
کسی کی شوخ اور میٹھی ھنسی کے
ناچتے سر بھی اڑائے ساتھ لاتی ھے۔
یہ دل اوروں کی خوشیوں کا بھی دکھ آخر سہے کب تک ؟
کبھی جب چاندنی کھلتی ھے
بازاروں میں نیلی روشنی میں دیکھتا ھوں
دور سے آتی ھوئی ملتی ھوئی راھیں ،
کبھی اٹھتے کبھی رکتے قدم اور جھومتے شانے
سہکتی مست شاخوں کی طرح الجھی ھوئی بانہیں
کبھی فٹ پاتھ کے پتھر کو چھوتا ریشمی آنچل
یہ آوازیں ،
اگر تھک کے بھی سو جائیں
تو ان کی گونج کی ھلکی سی لرزش بھی
مرے کانوں کو ڈستی ھے

مری آنکھیں اگر بے نور ہو جائیں
تو ایسی روشنی کی تیز کرنوں سے
ہر اک تصویر میرے ذہن میں اپنے چمکتے روپ میں
ہنستی ہے، بستی ہے
یہاں غاروں کی تاریکی سی چھا جائے
ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ آئے،
مگر اب یہ رلانے والا دروازہ ہمیشہ کے لئے
میں بند کر دوں گا
مری آنکھوں سے گھل گھل کے یہ نیر
آخر بہیں کب تک؟
یہ دروازہ کھلا آخر رہے کب تک؟

آوارہ

کوئی یاد ایسی نہیں
جو مجھے راہ چلتے ہوئے روک لے ، میرا دامن پکڑ لے
مرے پاؤں میں ایک زنجیر سی ڈال دے
کوئی بھی ایسا بیتا ہوا پل نہیں
مست جھونکے کی مانند جو گنگناتا ہوا دور سے آئے۔
ویران آنکھوں سے لپٹے
کسی بھولی بسری ہوئی بات کا گیت گائے۔
مرے سامنے ایک پھیلا ہوا جال ہے راستوں کا
قطاریں ہیں ، بجلی کے کھمبوں کی ، اونچے مکانوں کی ، پٹریوں کی
لیکن کوئی راستہ ، کوئی بھی روشنی
کوئی کھڑکی ، کسی پیڑ کا سایہ ایسا نہیں ہے ،
جسے دیکھ کر
مہربان آنکھ کی مسکراہٹ مجھے یاد آئے
بھٹکتی ہوئی روح کو اپنی بانہوں میں لے لے !

شہر اور زنجیر

درد کی رات پھر آ گئی
میرے پاؤں کی زنجیر پھر جانے مجھ کو کہاں لے چلے گی ؟
کبھی شہر کی نیم روشن سی ویران گلیاں
خمیدہ سی دیوار کے سائے سائے
میں پاؤں میں کنکر چبھوتا چلوں گا ۔
کبھی چوڑی چکلی سی بل کھاتی سڑکوں کی
ھنستی ہوئی رونقوں میں
سلگلتی ہوئی خوشبوؤں کی جنوں خیز لہروں کے ریلے میں
بے بس اُڑوں گا ۔
کھلی بارکوں میں
درختوں کے چمکیلے پتوں پہ گرتی ہوئی روشنی میں
کبھی چاند کے نیلگوں سائے میں بیٹھ کر
درد کے تیز کانٹے نکالوں گا ، چپ چاپ !
بجھتی ہوئی رات کے آخری پہر میں
سونے بستر کی ڈستی ہوئی ناگنوں پر
میں بھوکے بدن کو رلاتا رہوں گا

خواہش کا شور

میں اس نگر کی تلاش میں ہوں
جہاں پہ ہر شام چاند کی گود سے فضاؤں میں پھول اتریں
ڈگر ڈگر کی اُداس خوشبو دلوں کو میٹھا سا درد بخشے
جمیل اور سو گوار چہروں پہ دائمی رونقوں کا جادو ،
نشے میں کھوئی سی مست سانسوں میں
خواہشوں کا اُداس دھیما سا شور
آنکھوں میں آرزو کی کتھا کہانی
لرزتے آنسو خموش معصوم دھڑکنوں کی زبان کھولیں
بہار سے آنچلوں کے سائے میں
ڈالیوں سی مچلتی بانہیں سکوں بھرا ایک آسرا ہوں
اور ایسے سونے سمے کی رت میں
ان آنسوؤں کے خموش میلوں ، دکھوں کے نا شاد جمگھٹوں میں
یہ ایک دل دوسرے سے ہر گز بچھڑ نہ پائے

انجام

کیا خموشی ہی سدا انجام ہے ؟

دل کو دھڑکاتی ہوئی سب آہٹیں چپ ہو گئیں
سانس کی سرگوشیاں میٹھی ہوا میں کھو گئیں
خواہشوں کی دلہنیں کروٹ بدل کے سو گئیں
دور کیسے ہوگئے ہیں ہاتھ وہ خوشبو بھرے
وہ چمکتے راستے ، گلیاں ، نگر جادو بھرے
اب تو ہیں جھونکے ہوا کے دکھ بھرے آنسو بھرے
شام جب آئے کسی ویران گوشے میں چلو
آنکھ سے مالا پروو سانس ٹھنڈے سے بھرو
چپکے چپکے اپنے دکھ کی آگ میں بیٹھے جلو
اب کوئی چاہت بھرے گیتوں کا متوالا نہیں
اس اندھیرے میں صدا کو کوئی اجیالا نہیں
کوئی پل بیتی ہوئی باتوں کی خوشبوئیں لئے
سونے گھر میں اب کبھی لوٹنے والا نہیں -

اس کے بعد

پرانے گھر میں کوئی رہے کیا
ہر ایک شے سے تمہاری بانہیں لپٹ رہی ہیں ،
فضا میں اب تک
تمہارے ملبوس اور بدن کی نشیلی خوشبو
رچی ہوئی ہے
ہر ایک گوشے میں
ہلکی ہلکی تمہاری آواز تیرتی ہے
خموش ویران آئینے میں تمہاری آنکھیں
ہر آنے والے کو روکتی ہیں
اداس گھر میں جو کوئی آئے
تمہارے سانسوں کا شور پا کے
تمہاری دھڑکن کا گیت سن کے
وہیں دبے پاؤں لوٹ جائے۔

گھر

یاد ہے مجھ کو ابھی تک اُن کا بیلوں والا گھر
سرخ پھولوں سے ڈھکے تھے صحن کے دیوار ودر
اُس کی ہر ایک بات پیاری اُسکی ہر شے جادوگر
نیلے پیلے سرخ رنگوں کی تھی اک گڑیا کوئی
ریشمی سے بال اُس کے، سبز آنکھیں جھیل کی
خود ہی مجھ سے روٹھ جاتی خود ہی من جاتی کبھی،
شام ہوتے ہی جل اٹھتا اُن کے آنگن کا دیا
تھرتھراتی لو ، سلیٹی سا دھواں اٹھتا ہوا
کھانا پکنے کی وہ خوشبو میٹھی باتوں کا مزا
مسکراتے ہونٹ ، شیریں اُن کی امی کی زبان
شور کرنے پر جھڑکنا ، روٹھنے پر مہرباں
نیم روشن گرم کمرے میں کہانی کا سماں
دیو اور جنوں کی ہیبت ، غم زدہ کوئی پری
کانچ کے نیلے محل، جادو کی نازک سی چھڑی
خوف سے سہما ہوا میں ، ڈر سے وہ دبکی ہوئی
آج بھی ہے وہ گلی ویسی ، وہ پیارا گھر وہیں
سرخ پھولوں کی مگر بیلیں نہیں، گڑیا نہیں
چڑچڑی عادت کی اک بڑھیا ہے اس گھر کی مکیں !

رات کا جادو

رات کے آنگن میں نیلا چاند جب روشن ہوا
ہر مکاں ہر پیڑ پر چھانے لگی کالی گھٹا
بال کھولے پھر رہی ہے سونی گلیوں میں ہوا
بجھ گئے اک ایک کر کے سب منڈیروں کے دیئے
سو گئے پھولوں سے چہرے گود میں سپنے لئے
جاگتی ہے آنکھ جی پر درد کی چھاؤں کئے
مہرباں بے درد چہرے بیوفا بچھڑے ہوئے
سامنے آتے ہیں کیسے درد میں ڈوبے ہوئے
لاکھ چاہیں کوئی بیتی بات بیکل کیوں کرے
رات کے جادو سے لیکن کس طرح کوئی بچے

امید

یہاں سے آگے اداس جنگل کا راستہ ہے
یہاں سے تم لوٹ جاؤ،
پلٹ کے دیکھو وہ جاگتا شہر
رنگ میں تیرتے ہوئے کھڑکیوں کے شیشے
نشے میں ڈوبی ہوئی صدائیں
خوشی سے بھرپور قہقہے
وہاں منڈیروں پہ چاند پونم کا
اپنی ٹھوڑی ٹکائے شفقت سے ہنس رہا ہے
تم اس اندھیرے اداس رستے پہ کیوں مرے ساتھ آرہی ہو
میں تم سے کہتا ہوں لوٹ جاؤ
یہاں سے راہیں گھنے اندھیروں میں کھو چلی ہیں
یہاں سے آگے اداس جنگل کا راستہ ہے

بارش کا گیت

یاد کی روٹھی بدلی کو لائی ہوں میں
ایک مدت سے بچھڑے ہوئے
ان کواڑوں سے ، دیوار سے
آج مل مل کے رونے دو،
ان آنسوؤں، ٹھنڈے سانسوں بھرے گیت سے
دکھ کی مالا پرونے دو
میں دکھ کے جنگل کی بھیگی ہوئی شام ہوں
خالی کمروں میں روتی ہوئی آنکھ کا پھول ہوں
کوئی خواہش ہوں، پیغام ہوں۔

رنگ کی گونج

دودھیا پتھروں کی سلیں
نیلگوں نرم شفاف سی برف کی یہ تہیں
دھوپ کی منتظر ہیں،
ہوا کے سمندر کی لہریں ابھی سرمئی بادلوں کو اٹھائے
کسی اجنبی دیس میں گھومنے کے لئے چھوڑ آئیں گی۔
پھر ان فضاؤں کی نیلاہٹوں میں سے چھن چھن کے
نرم اور بنفشی سی کرنیں چمکتی ہوئی ناچتی آئیں گی
اور پگھلتی ہوئی برف
بے جان سے پتھروں کے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کی طرح
دور تک پھیلتی جائے گی
خامشی سے کہیں اونچی راہوں سے جھرنے کی مانند
در گر کے بیتے دنوں کی کہانی کہے گی
کہیں گونجتی وادیوں میں
ہر اک پیڑ کو
اپنے صدیوں پرانے دکھوں کے فسانے سنانے لگے گی
زندگی کا مدھر گیت گاتے چلی جائے گی
یہ مدھر گیت جو موسموں کے بدلتے ہوئے رنگ کی گونج ہے

دروازہ

رات،

اور کہرے میں کفنائی ہوئی سنسان لمبی سی گلی
موڑ پر اک گھر کا دروازہ کھلا ہے
تنگ لمبی سیڑھیوں کے پاؤں پر
جل رہی ہے ایک مدھم لالٹین !

ہسپتال

خزاں کی ویران رہگزاروں پہ
خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ
ہزار دکھ کی کتھا کہانی سنا رہی ہے
کہاں تلک کوئی
زرد پھولوں کی سوکھتی ان جھکی ہوئی گردنوں کو
چپ چاپ دیکھ کر سوچتا رہے
اور مہیب بے سلسلہ خیالوں کے تانے بانے سے بنتا جائے
کبھی کواڑوں کو ہولے ہولے سے کھٹکھٹاتی
ہوا کی دستک کو سنتا جائے
سسکتی اور ڈولتی ہوئی دھڑکنوں کو
گنتا رہے کہاں تک؟
ہرایک مایوس آنکھ اب منتظر ہے
ہمدرد، رحمدل مہربان شب کی
کہ اجلے اجلے پروں کو پھیلائے نیند آئے
چٹختی بے چین ہڈیوں میں
سلگتے جسموں میں!
آجگائے سکوں کا جادو،

کسی کے سینے میں
اُلجھی اُلجھی سی ڈوبتی اور اُبھرتی سانسیں
گئے دنوں کی بہار ایسی حسین یادیں !
اُداس آنکھوں میں
ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی چند کرنیں
فقط مسافر ہیں رات بھر کی ،
کھلے دریچے سے چاند اب جھانکنے لگا ہے
اُداس بے برگ ننگی شاخوں میں اُلجھا
بیمار نیلگوں سا ،
ہر اک کرن جس کی آنکھ سے دل میں
تیر بن کے اُتر رہی ہے ،
یہ چاندنی کتنی بد نما ہے ،
نہ جانے کب آسماں کی چھاؤں میں
سکھ ملے گا ؟
نہ جانے وہ کون شبھ گھڑی ؟
ہر ایک مرجھائی آس کا پھول جب کھلے گا ؟
اسی لگن کو ہر ایک دل
اپنے ساتھ چمٹائے جی رہا ہے
اسی لگن کا حسین ، ننھا سا ہاتھ
تھپکا رہا ہے سب کو

کہ رت پھرے گی ، نئی نویلی ہوا چلے گی
ھری بھری مست آستینیں ہوا میں
پھر پھڑ پھڑائیں گی ، گنگنائیں گی
زرد خشک سی ٹہنیاں ھنسیں گی
یہ بستیاں رنگ روپ میں
پھر رسیں بسیں گی
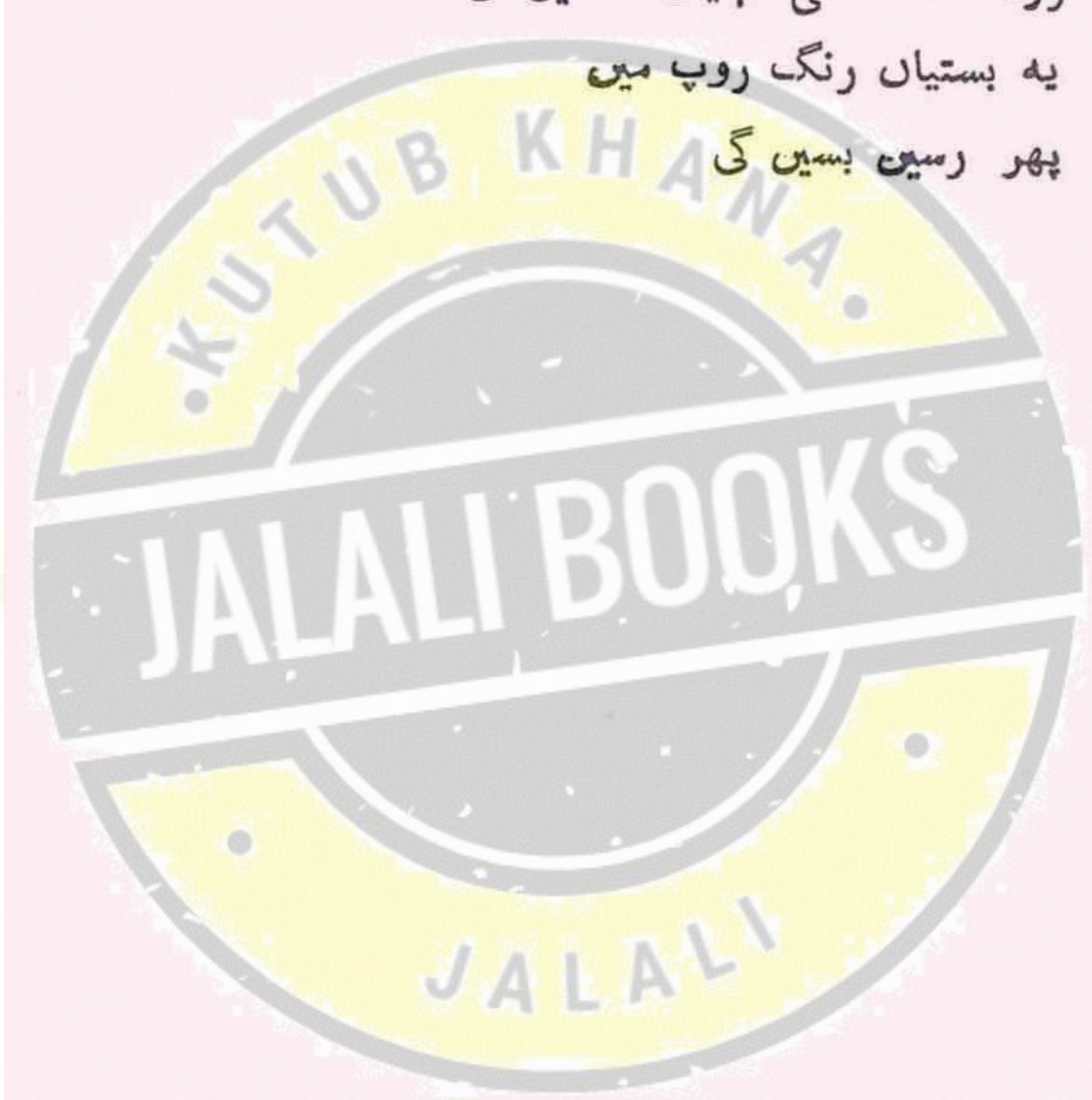
ہوا

کہیں سوئی کلیوں میں میں سانس روکے ہوئے چل رہی ہوں
کہیں سونی سڑکوں پہ
سکھ ڈھونڈنے والے تنہا دلوں کی طرح
بال کھولے ہوئے
اپنی رگ رگ میں تنہائی کا زہر گھولے ہوئے
کتنی بے چین ، بے کل رہی ہوں
کوئی سونا آنگن ہوں ـــــ اندھی گلی ہوں
میں سویا ہوا شہر ہوں ،
سوئے ساگر سے اٹھتی ہوئی درد کی لہر ہوں ۔
میرے دامن کو دیکھو تو دکھ کے سوا کچھ نہیں
ان سنے ، ان کہے کتنے پیغام ہیں
لاکھ من چاہے ، پوجے ہوئے نام ہیں۔

مبہم

رات کے جنگل میں اک صدیوں پرانا محل ہے
اس کے اندر جل رہا ہے
لال اور لمبی لہو جیسی زباں والا چراغ،
راستے کے ناگ کے سر کو کچل کر
جو بھی کوئی اس کے اندر جائے گا
لوٹ کر اشکوں کا
آہوں کا خزانہ لائے گا۔

وہ رات

کانپتی روشنی دینے والا دیا یاد ہے
رات کی سرد بھیگی ہوا میں
کواڑوں کی کھٹ کھٹ
نم آلود ہونٹوں کے وحشی سے بوسوں کی آواز
ابھرتی ہوئی،
مست سانپوں کی مانند لپٹے ہوئے دو بدن
ان کے پھنکارتے سائے دیوار پر یاد ہیں
اس کی مستی بھری آنکھ میں
رات بھر جلنے والا دیا یاد ہے۔

خوف

اس گھر کی سب سے اوپر کی منزل میں
رہنے والی لڑکی
مجھ کو سارا دن اپنی حیران آنکھوں سے
تکتی رہتی ہے۔
رات کو اس گھر کا دروازہ کھلتا ہے
لمبے لمبے ناخنوں والی ایک چڑیل
نکلتی ہے،
جو چیخ چیخ کر ہنستی ہے
اور میری جانب بڑھتی ہے۔

سویرا

گلی کے کونے کا لیمپ دھیمی سی روشنی دے کے سو چکا ہے
کہیں منڈیروں پہ سینہ تانے ہوئے کسی مرغ کی صدائیں
گھروں کی دھلیزوں اور دکانوں پہ سوئے کتوں کی
نیند میں چونک چونک کر بھاگنے کی آواز
اس دھندلکے کو چیرتی ہے ۔
کہیں کواڑوں ، چقوں کی درزوں سے زرد سورج کی چور کرنیں
کھلی چھتوں اور بند کمروں میں ، آنگنوں میں
دبے دبے پاؤں چپکے چپکے سے
بے خیالی میں سوئے جسم اور نیم عریاں لپٹی ٹانگوں
بھری بھری اور سڈول بانہوں کی چاندنی
اور سانس لیتے ہوئے کھلے سینے جھانکتی ہیں
اداس کھرے کی، چادروں میں ڈھکی چھپی کھڑکیاں، دریچے
ضعیف ہاتھوں کی مست جنبش سے کھل رہے ہیں ،
دھوئیں میں لپٹی ، کراہتی زندگی کا
پھر شور جاگتا ہے ۔

خواب میں

میں بادل ہوں
کسی اجڑے ہوئے مندر کی ٹوٹی سیڑھیوں پر
آکے رکتا ہوں
خموشی سے
پرانے بند دروازوں کی میلی زرد محرابوں پہ
جھکتا ہوں۔
ٹھٹھرتی کانپتی بانہوں سے
میں چاروں طرف سوکھے ہوئے پتے گراتا ہوں۔
میں بادل ہوں
کسی اجڑے ہوئے مندر کو چھوکے
لوٹ جاتا ہوں۔

آنکھیں

سارا دن شہر کی نیلی نیلی رگوں میں
دھڑکتی ہوئی زندگی کا سماں
پیلے پیلے مکانوں کی رنگت، سیہ چمنیوں کا دھواں
دیکھتے دیکھتے
درد نس نس میں گھلنے لگا ہے۔
سارا دن کالے حرفوں کی بے جان لمبی قطاروں کے پیچھے بھٹکتے ہوئے
دن سے اُجلی سی ہر بات اُتری ہوئی ہے۔
ہوا مہرباں انگلیوں سے ہمیں تھپتھپانے لگی ہے
تھکی چور پلکیں خموشی سے گرنے لگی ہیں!
سیہ رات میں
اب ہمیں نیند کی جھیل میں تیرنے دو،
کسی پھول سے پیارے چہرے، کسی نرم و نازک بدن کو
ذرا دھیان کے محل میں اب سجانے دو،
بے چین سہمی ہوئی روح میں
سکھ کا جادو جگانے دو

بارش اور پرانا شہر

گرتی ہوئی دیواروں والے شہر پہ بادل گہرا ہے
چاروں جانب خاموشی کا، سونے پن کا پہرا ہے
بارش کی تاریکی ہے گلیوں میں قبرستانوں میں
سانپوں ایسی آوازیں ہیں بے آباد مکانوں میں
گرد و غبار نے جال بنے ہیں یاد کے روشندانوں میں
خالی رستوں پر اک تنہا پتا اُڑتا جاتا ہے
ہر اک گھر میں میرا سایہ میرے سامنے آتا ہے
گئی رتوں کی بارش کا چمکیلا نقش دکھاتا ہے

مصور

لکیریں زندگی کی اُلجھنیں بھی ہیں
لکیریں مست دھارے کا سکوں بھی ہیں
لکیریں بھاگتے اور شور کرتے دن کا ہنگامہ
لکیریں ریتلے ساحل کی بھیگی رات کی ناگن کا سایہ بھی
کبھی رنگوں کی آوازوں میں ہے
اونچی منڈیروں کے عقب سے جھانکنے والے سنہرے چاند کا نغمہ
نئی رت، کونپلوں اور پتیوں پھولوں کی خوشبوئیں،
کبھی رنگوں کی آوازیں
درختوں کے سلگتے آنسوؤں کا درد مدھم سا،
کہیں تاروں کی مالائیں لئے آکاش کی مغموم سی دیوی،
کبھی یہ رنگ
میرے ذہن کی بھٹی کے کندن سے دمکتے سرخ انگارے
کبھی روتی ہوئی اس زندگی کے درد کا ماتم
کہیں ان آنسوؤں میں قبرسی گلیوں کا سناٹا
کہیں کہرے میں کفنائی ہوئی شمعیں گذرتی ہیں۔

بوڑھے سانپ کی موت

ایک ہی سانس میں تیز ہوا میں لاکھوں بھنور جگانے والا
زرد کتاب کے کالے اور سفید ورق الٹانے والا
مٹی کے ماتھے پر عمر کے دکھ کا نقش جگانے والا
ریت پہ ناچنے والا ، سایہ پانی پر پھیلانے والا
روشنی دینے والا ھیرا کالا سانپ بنا ھوا ھے
صبح و شام کے آئینے کا سارا جادو ٹوٹ چکا ھے
سب سے اونچا لاکھوں سال پرانا گنبد پھٹا ھوا ھے
جلتا سورج ٹھنڈا ھو کر پیلی دھول میں گرا ھوا ھے
اونچا پیڑ ھوا کا پتہ پتہ ھو کر بکھر گیا ھے
سب سے پرانی خاموشی کا دھواں فضا میں پھیل رھا ھے
سانپ ھزار زبانوں والا ، اپنے زھر سے مرا پڑا ھے

میں اور سورج

سورج میرے پاس مرے کمرے میں اُتر آیا ہے
پھیل رہی ہیں پیلی دیوارں پر اُس کے سرخ لبوں کی تصویریں
میرے گھر میں اندھیری شام نہیں ہے
میں بھی سورج کا سایہ ہوں
میرا اب کوئی نام نہیں ہے -
میرے سانس میں پھول ہزاروں کرنوں والا چمک اُٹھا ہے ،
سورج میری آنکھوں میں ہے
آنکھیں بند کروں تو پل میں
لاکھوں گہرے تیکھے رنگوں والے تیز سمندر میں
سورج ناؤ کی آواز
میرے سامنے کھولے گی سب ڈوبنے والے دن کے راز

میں اور موت

خون میں لت پت لاش تھی میری اور سینے میں تیر
پتھر کی اونچی دیواریں ، پاؤں میں تھی زنجیر
اجلے کفن کی چادر پر تھے سرخ گلاب کے پھول
لاکھوں لوگ اور روشنیاں اور قبرستان کی دھول ،
کبھی ہوا کے ہاتھ پر لکھا ہوا تھا میرا نام
اڑتے ہوئے پتوں کا ماتم ، زرد اور سونی شام
کبھی پیا ہے ہنس ہنس میں نے سارے دکھوں کا زہر
جنگل کی آواز کے کھوج میں چھوڑا ہنستا شہر
اک لمحے میں لاکھ انوکھے روپ لئے مرتا ہوں
وہ جو کہیں نہیں ہے اس کی خواہش بھی کرتا ہوں

شہر اور سورج

کھڑکیوں پر جھکنے والا آسمان بد رنگ ہے
سوکھی شاخیں
اور جلے دن کا دھواں ، بجلی کے تار
سر جکائے بیٹھنے والے پرندے —
شہر اور سورج کی اس برسوں پرانی جنگ کا انجام
گہری خامشی ۔
شام کی دہلیز پر سب کو سسکتا چھوڑ کر
وہ اندھیرے غار میں اب چھپ گیا ہے ،
ہم لڑائی میں همشیه هارنے والے سہی
پھر بھی اس مٹی کی خواهش ہی لئے
زخم پر مٹی ملیں گے
رات بھر میں جی اٹھیں گے
وہ دھکتی آنکھ ، اپنے هاتھ میں نیزہ لئے
صبح پھر سب کو بلانے آئے گا
شہر کے رستوں پہ ریزہ ریزہ کر کے
پھر ہمیں بکھرائے گا ۔

دریا

اکبر :
عبداللہ : ایک ملاح
جمیل : اکبر کا بیٹا
رحمت : عبداللہ کا ساتھی

اکبر : کشتی جو کنارے پر کھڑی ہے
تمہیں اسکے مالک ہو
عبداللہ : میں ہی اس کا مالک ہوں
لیکن تم کون ہو ؟
کہاں سے آئے ہو ؟
اکبر : دریا پار ہمیں جانا ہے
لے چلوگے
عبداللہ : اور یہ تمہارا ساتھی
ٹھیک تو ہے ؟
اکبر : ہاں ٹھیک ہی ہے

عبداللہ : لیکن مجھے تو بے ہوش نظر آتا ہے

اکبر : (گھبرا کر)

نہیں نہیں ، ایسی تو کوئی بات نہیں

اصل میں تھکا ہوا تھا

کافی دور سے ہم چلتے ہوئے آئے ہیں

رستہ بڑا اندھیرا تھا

جگہ جگہ کھیتوں میں کیچڑ تھا

بار بار پاؤں رکتا تھا

تھکن سے چور تھا

میں نے اسی لئے

اسے لٹا دیا ہے

عبداللہ : تھکن کے باعث سویا ہوا نہیں لگتا

سانس بھی کافی گہرا چلتا ہے

ماتھے پر پسینہ بھی ہے

ایسے ٹھنڈے موسم میں ---

اکبر : ہوں، ہوں، پاس نہ جاؤ

جگاؤ نہیں

پل دو پل آرام کر لے تو بہتر ہے

میرا بیٹا جمیل !

عبداللہ : کوئی حادثہ تو نہیں ہوا
اکبر : نہیں نہیں
عبداللہ : اس ویران جگہ پر
ایسی رات میں
جب تک کوئی بھید نہ ہو
کون آتا ہے
تم یہاں کس لئے آئے ہو
اکبر : بس یہی کہ دریا پار ہمیں جانا ہے
ہاں تو کہو پار چلوگے
عبداللہ : میں اس وقت نہیں جاؤنگا۔
اکبر : میرے پاس بہت کچھ ہے
منہ مانگا کرایہ دوں گا
میرا اس پار جانا
آج بہت ضروری ہے
عبداللہ : لالچ نہ دو
رات اندھیری ہے
غصے میں بپھری موجوں سے
لڑنا کچھ آسان نہیں ہے
اکبر : دیکھو جیسے بھی ہو
ہم کو پار اتارو

پھر تم بوڑھے ، تجربہ کار دکھائی دیتے ہو
ایسی بھی کیا مشکل ہے

عبداللہ : میں نے سینکڑوں طوفاں دیکھے ہیں
لیکن ایسی راتوں میں
میں کشتی پانی میں نہیں ڈالتا
یہ میری مجبوری ہے

اکبر : تم چاہو تو میری مشکل حل کر سکتے ہو

عبداللہ : لیکن بھائی ایسی بھی کیا جلدی ہے
پو پھٹنے پر لے جاؤں گا

اکبر : مگر مجھے تو رات گذرنے سے پہلے
پار پہنچنا ہے
دور کنارا چھونا ہے
کیا معلوم سویرے کیا ہو جائے

عبداللہ : صبح تلک یہ تیز ہوا تھم جائے گی
چڑھتا پانی اتر چکے گا
لیکن جب تک رات کھڑی ہے
ایسا کوئی نہیں
جو تیز ہوا کے وحشی گھوڑے کو
قابو میں لائے
لاکھوں بھنور جگائے

دیکھو تو یہ بادل کتنا گہرا ہے
ایک ہی سانس میں تیز ہوا
دئے کی لو بجھا دیتی ہے
شام سے میں نے کتنی بار جلایا ہے ،

تم میرے انکار سے کچھ مغموم دکھائی دیتے ہو!

اکبر : ہاں میرا جانا بہت ضروری ہے
عبداللہ : جانا بہت ضروری ہے تو
پل پر سے کیوں نہیں جاتے
یہاں سے پار اُتر بھی جاؤ
تو میلوں پھیلا جنگل ہے

پل زیادہ دور نہیں ہے
یہی اڑھائی تین میل کے فاصلے پر ہے
اکبر : ہمیں بہت جلدی ہے
تھکے ہوئے ہیں
بس ابھی یہیں سے پار اترنا بہتر ہے
عبداللہ : تھکے ہوئے ہو تو سستا لو
میری جھونپڑی حاضر ہے

یا پھر شہر چلے جاؤ

صبح سویرے پار چلیں گے

اکبر : شہر کو واپس جانا مشکل ہے

عبداللہ : تو پھر آگے آجاؤ ، روشنی میں

میری جھونپڑی میں

بیٹھنے کو کوئی چیز نہیں ہے

ہم گنوار اور جاھل لوگ

اسی زمین پر بیٹھتے سوتے ھیں

اکبر : سب ٹھیک ہے

میں خود محنت اور مشقت کا عادی ھوں

ایسا موسم کتنی دیر رھا کرتا ہے ؟

ھوا بہت ٹھنڈی ہے

کھڑکی . ھی کر دو

عبداللہ : یہ طوفاں تو آنکھ جھپکنے میں آیا ہے

اکبر : ھاں جب ھم شہر سے نکلے

موسم بالکل صاف تھا

لیکن لہراتے کھیتوں میں آتے ھی

لال اندھیری آنْدھی
پھر چاروں جانب
گھرے تہہ در تہہ بادل اُمڈے
سارا منظر دھندلایا
ہم چلتے رہے
رستہ بڑا اندھیرا تھا
جگہ جگہ کھیتوں میں کیچڑ تھا
بار بار پاؤں رکتا تھا
آسماں کھلا تو سامنے
دریا چمک رہا تھا
یوں لگتا ہے جیسے سب کچھ
پل میں ہوا ہے
وہ پل اب بھی جاگ رہا ہے
دریا بپھر رہا ہے

عبداللہ : اب بھی چاروں جانب
کالی چادر تنی ہوئی ہے
وہی ہوا ہے
لمحہ لمحہ چڑھتے پانی کا شور
ـــــ یہ طوفاں نہیں تھمنے کا

اکبر : ایسا نہ کہو

عبداللہ : تم شہر میں کیا کرتے تھے

اکبر : ملازمت

عبداللہ : کیا آگے بھی

اسی سلسلے میں جانا ہے

اکبر : ہاں میں جن کا ملازم ہوں

وہ لکڑی کے تاجر، جنگل کے مالک ہیں

اس کے بہت سے دشمن ہیں

خطرہ ہے وہ آج رات

شاید آگ لگا دیں

اسی لیے تو میرا جانا بہت ضروری ہے

عبداللہ : اور تمہارے بیٹے کا جانا بھی بہت ضروری ہے ؟

اکبر : ہاں ہاں، خیر ــــ

یہاں اکیلے رہتے ہو

عبداللہ : ہاں میں اکیلا رہتا ہوں

تم گھبرائے نظر آتے ہو

اکبر : نہیں نہیں

میں نے یونہی پوچھا تھا

عبداللہ : ایسے لگتا ہے

میں نے تمہیں پہلے بھی دیکھا ہے

شکل بہت مانوس

جانی پہچانی لگتی ہے

اکبر : یہ کیسے ہو سکتا ہے

میں تو پہلی بار یہاں آیا ہوں

تم کو دھوکا ہوا ہے

کوئی اور ہوگا

عبداللہ : دھوکا بھی ہو سکتا ہے، لیکن اکثر

ایک جھلک دیکھی ہوئی شکل

عمر کے واسطے دل پر نقش رہا کرتی ہے

مدت بعد بھی دیکھو فوراً یاد آجاتی ہے

—— تم بھی یاد کرو

اکبر : یہ دریا کا کنارا، یہ ویرانہ

یہ جھونپڑی —— تمہارا چہرہ

سب کچھ پہلی مرتبہ دیکھا ہے

میں یہاں کبھی نہیں آیا

فقط تمہارا واہمہ ہے

عبداللہ : شاید تم پچھلی باتیں بھولنا چاہتے ہو

سنو، میں تمہیں یاد دلاتا ہوں

کہ ہم پہلے پہل کہاں ملے تھے

چاروں طرف پہاڑ تھے

چیلوں کا جنگل تھا
ڈھلوانوں پر لمبی لمبی گھاس
میدانوں میں دھوپ
میں تم کو اُس جنگل سے آوازیں دیتا
چوٹی کی سمت بلاتا
تم میری آواز کے پیچھے بھاگتے
گرتے سنبھلتے ، ہانپتے کانپتے سب سے
اُونچی چوٹی پر آنے کی کوشش کرتے
بادل کو چھونے کو ہاتھ بڑھاتے
میں آوازیں دیتا رہتا
آہستہ آہستہ رستوں سے اوجھل ہو جاتا
جنگل میں کھو جاتا
سورج کے ساتھ پہاڑ کے پیچھے چھپ جاتا
اندھیرا چھانے پر تم لوٹ آتے
میں ہر روز تمہارے ساتھ یہ کھیل رچاتا
میں چوٹی کے بادل کی آواز
تم مست ہوا کی لہر

یاد آیا ــــ ؟ کیسا کھیل تھا
اکبر : جنگل اور پہاڑ

آونچی چوٹی ، بادل
آونچی چوٹی کا بادل
لیکن یاد نہیں آیا
میں نے ضرور کہیں دیکھا ہے

خواب یا بچپن کی تصویریں !
اس تصویر میں لیکن میں نے
تمہیں کبھی نہیں دیکھا
چیل کے جنگل کی آواز ، تمہاری آواز

نہیں کبھی نہیں دیکھا
عبداللہ : دوسری مرتبہ شہر میں ——
تم اس شہر میں پہلی مرتبہ آئے تھے
اپنے باپ کی خواہش کو ٹھکرا کر
ھنستے بستے گھر کو چھوڑ کر
تمہیں یہ شک تھا
تمہارا باپ تمہاری ماں کا قاتل ہے

تم رہ رہ کر سوچتے تھے
یوں جینے کا مقصد کیا
—— بلکہ اپنی جان گنوانے پر آمادہ تھے

ھاتھ پکڑ کر روکنے والا میں تھا
کیا یاد آیا ھے ؟

اکبر : مگر کچھ سمجھ نہیں آتا

عبداللہ : اور تیسری بار
شاید آخری بار یہاں ملے ھیں

اکبر : میرے بارے میں تم سب کچھ غلط بتاتے ھو
کونسے قتل کی باتیں کرتے ھو
میرے باپ نے میری ماں کو قتل نہیں کیا تھا
کہتے ھیں ملک میں کوئی وبا پھیلی تھی
میں چھوٹا ھی تھا جب
میرے اماں ابا مر گئے تھے

تم کیسی باتیں کرتے ھو
شاید وقت بتانے کو تم
کوئی قصہ لے بیٹھے ھو

عبداللہ : تم میری باتوں کا شاید برا مناتے ھو
میری عادت ھی کچھ ایسی ھے
باتیں کرنے کا شوقین بہت ھوں
لیکن وقت پڑے تو چپ بھی رہ سکتا ھوں
یہ سب کچھ میں نے دریا سے سیکھا ھے

اکبر : برا منانے کی کوئی بات نہیں
آدمی دلچسپ ہو
اور عجیب بھی
(ہوا سے دروازہ کھل جاتا ہے)
دروازے پر کون تھا
کوئی سایہ ابھی ادھر سے آدھر گیا ہے
شاید تمہارا ساتھی ہو
دیکھو تو

عبداللہ : باہر کوئی نہیں ہے
فقط ہوا کی دستک تھی
ذرا ذرا سی آہٹ پر تم ڈر جاتے ہو
بار بار دروازے کو دیکھتے ہو
یقین کرو
ہماری باتیں کوئی نہیں سن سکتا
لیکن تم ڈرتے کیوں ہو ؟

اکبر : یہ سنسان جگہ
اور تمہاری باتیں
ڈر کیوں نہیں آئے گا

عبداللہ : ڈر تو اپنے آپ سے آیا کرتا ہے

اکبر : میں تو اپنے آپ سے کبھی نہیں ڈرتا ، البتہ
چڑھتے دریا کا پانی
اور ہوا کی دہشت ناک صدائیں
خوف جگاتی ہیں
عبداللہ : کبھی کبھار تو میں بھی ڈر جاتا ہوں
اکبر : تم بھی ڈر جاتے ہو ؟ کس سے ؟
عبداللہ : پانی سے
اکبر : پانی سے ؟
دن رات اسی کے ساتھ بسر کرتے ہو
پھر بھی ڈرتے ہو
عبداللہ : ہاں میں اب بھی ڈرتا ہوں

دور کے جنگل میں جب
تیز ہوا کی سائیں سائیں
چلتی چلتی پانی سے آ ٹکراتی ہے
مستی میں سویا ہویا ناگ
اپنے سر کو اٹھائے
جاگ اٹھتا ہے
چاروں جانب لہراتا ہے
غصے میں پھنکارتا ہے
لمبی لمبی گھاس پر

لہراتے کھیتوں میں
ناچتا ہے
میں اس ناگ کو پوجتا ہوں
میں اس ناگ سے ڈرتا ہوں

اکبر : پانی سے ڈرنا ایک بہانہ ہے
تم چاہو تو ہم کو لے جا سکتے ہو
پھر جینا مرنا تو قسمت کی باتیں ہیں

عبداللہ : جینا مرنا تو قسمت کی باتیں سہی
لیکن جب تک تم پہچانو نہیں
میں موت کے منہ میں جانے کو تیار نہیں
پھر تمہیں مجھ پر بھروسہ بھی نہیں

اکبر : مجھ کو تم پر پورا پورا بھروسہ ہے

عبداللہ : لیکن مجھے حقیقت کا کچھ علم نہیں ہے

اکبر : کیسی حقیقت ؟

عبداللہ : ایسی اندھیری رات پار اترنے کی !

میں دریا سے جھوٹ نہیں کہہ سکتا
ورنہ دریا میری مدد نہیں کرے گا

میں ہر وقت تمہارے ساتھ تھا
اب بھی تمہارے ساتھ ہوں

مجھ پر بھروسہ کرو

اکبر : وعدہ کرو تم میری مدد کروگے

عبداللہ : میں وعدہ کرتا ہوں

اکبر : میرے لیے شہر میں رہنا
خطرے سے خالی نہیں
میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے
میں نے قتل کیا ہے
میں اپنی بیوی کا قاتل ہوں
میں راتوں رات یہاں سے
پار پہنچنا چاہتا ہوں ، جنگل میں

عبداللہ : لیکن تمہارا بیٹا ـــــ
اپنی ماں کے قاتل کے ساتھ چلا آ رہا ہے

اکبر : اسے خبر نہیں
میں اس کی ماں کا قاتل ہوں

میں اب ہرگز یہ نہیں چاہتا
یہ بھی میری طرح دکھ جھیلے
پربت کی اونچی چوٹی اور بچپن کے
دھندلے خوابوں سے لے کر
اس دریا کے کنارے اور طوفان تلک

میں نے دکھ ہی دکھ دیکھے ہیں
لیکن سب دکھ میرے لیے تھے
اس کے لیے نرم ہواؤں کی لہریں ہیں

عبداللہ : تم نے اپنی بیوی کو کس لئے قتل کیا
اکبر : میری بیوی اس کی ماں
وہ ڈائن خون پہ پلنے والی
مجھ میں اور میرے بیٹے میں
دیوار بنی تھی
اور یہ میرا بیٹا میرے ساتھ نہیں چلتا تھا
میں جو پہلے سفر کی شام ہی سے
بچھڑ گیا تھا ، تنہا تھا
عبداللہ : یوں کہو کہ تمہیں اپنی بیوی سے نفرت تھی
اکبر : یہ تو غلط ہے
شاید بہت محبت تھی
پاگل پن کی حد تک
جب میں پہلے پہل اس شہر میں آیا
اس کی آنکھوں کی آواز نے ایسا جادو کیا
میں پاگل ، دن رات
اس کی آگ میں جلنے لگا

شام کی دہلیز

میں نے موت کو زندگی سمجھا
زہر کو امرت جانا
پھر وہ زہر آہستہ آہستہ
میری رگوں میں اترنے لگا
پھولوں کو نیلا کرنے لگا

پھر میں اُس کے لیے ٹوٹا ہوا کھلونا تھا

پھر مدت کی خاموشی میرے اندر
شعلہ بن کر چمک اٹھی
میں نے اپنے آپ کو ڈھونڈ لیا

وہ چاہتی
جمیل اُسی کا دوسرا نقش بنے

وہ اُس کے دل میں
میرے لیے نفرت کے بیج اُگاتی
اُس کو میرے پاس نہ آنے دیتی
میں نے اُس کے ساتھ پرانا کھیل رچایا
اک لمحے وہ مجھ سے لپٹی کانپ رہی تھی
دوسرے لمحے مجھ سے جدا
خون میں لت پت پڑی ہوئی تھی

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی

عبداللہ : جمیل کو بھی کوئی خبر نہ ہوئی ؟

اکبر : یہ گھر سے باہر تھا

رستے میں ملا ، میں باتیں کرتے کرتے لے آیا

رستے میں واپس جانے پہ بضد تھا

میں نے بہت سمجھایا ، مگر نہ مانا

آخر میں نے اس کے سر پر زور سے مکہ مارا

یہ بیہوش گرا

اسے اٹھائے اٹھائے یہاں لے آیا ہوں

عبداللہ : اگر یہ ضد کرتا تھا ، اس کو جانے دینا تھا

اکبر : یہ کیسے ہو سکتا تھا

میرے لیے اب اس کے سوا کچھ بھی نہیں

جس کیلئے میں زندہ رہوں

(جمیل کے پاس جاتا ہے ، جمیل کروٹ بدلتا ہے ۔)

ابھی تک ہوش نہیں آیا

یہ اس وقت بہت ہی ڈرا ہوا تھا

سمجھ رہا تھا ، میں جو اس کا باپ ہوں

اس کا دشمن ہوں

میرا بیٹا ـــــ

دھیرے دھیرے محبت کرنے لگے گا

عبداللہ : کافی حیرت ناک کہانی ہے

اکبر : یہی حقیقت ہے

شہر سے مجھ کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے
یہاں سپاہی آ جائیں گے
تم چاہو تو
میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو
موت اور زندگی دونوں تمہارے ہاتھ میں ہیں

عبداللہ : موت اور زندگی دریا کے دھارے میں ہیں
ہم سب دریا کے رحم و کرم پر رہتے ہیں
ہم سب دریا میں رہتے ہیں
چاہے تو اک لہر اٹھائے
سکھ کے کنارے پر لے جائے
چاہے تو تنکوں کی مانند اڑائے
ریت میں دفن کرے
مستقبل اور ماضی
اس دریا کے دونوں کنارے
دونوں آنکھ کا دھوکہ
دونوں بدلنے والے

ایک کنارا جنگل کی تاریکی
دوسری جانب شہر اور اسکے الجھے سائے
رستوں کا جال

اکبر : شہر کی خواہش میرے لئے نہیں ہے
شہر کے نام سے ڈرتا ہوں
مجھے جہاں بھی اور کہیں چاہو لے جاؤ
لیکن میرے آگے شہر کا نام نہ لو

عبداللہ : لیکن دوسری جانب جنگل ہے
جاؤ گے تو تاریکی میں کھو جاؤ گے
ساری عمر
سکھ کے پھول کی خوشبو نہیں ملے گی

اکبر : مجھے یہاں سے ہر صورت جانا ہے
آدھی رات تو بیت چکی ہے
دیکھو شاید پانی کا زور گھٹا ہو
(عبداللہ کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے ، رحمت داخل ہوتا ہے)

عبداللہ : یہ ہے میرا ساتھی رحمت
رحمت کدھر سے آئے ہو

رحمت : ابھی ابھی میں کشتی باندھ کے

اس جانب کو آ هی رها تها
میں نے کچھ سائے دیکھے هیں
ان کے هاتهوں میں روشنیاں هیں
کافی لوگ تهے ،

کسی تلاش میں آتے هوئے لگتے هیں ،

اکبر : لیکن اتنی رات گئے ؟ اور اس طوفان میں ؟
رحمت : شاید دریا میں کوئی ڈوب گیا هو
عبداللہ : کیسے لوگ تهے ؟
رحمت : کیا کهه سکتا هوں

میں نے تو بس دور سے دیکھا هے
اکبر : کتنے فاصلے پر هوں گے
رحمت : یہی کوئی آدھ کوس پر
—— اچھا ، میں چلتا هوں ، اور تم اپنے
مہمانوں سے بات کرو ،
میں تو تمہاری جھونپڑی میں
روشنی دیکھ کے ٹھہر گیا تھا ،
(رحمت چلا جاتا هے)

اکبر : دیکھو جیسے بھی هو ،
تم کشتی کھولنے کی، تیاری کرو ،

اور میں جمیل کو لاتا ہوں،

عبداللہ ۔ تم اُسے لے جاؤ گے

خود ہی کہتے ہو وہ جانے پر راضی نہیں

ہے ،

(دونوں جمیل کی طرف بڑھتے ہیں ،

جمیل بڑ بڑاتا ہے)

جمیل ۔ ہم تو شہر سے دور نکل آئے ہیں

ابا اب تو گھر کو لوٹ چلیں

میرے پاؤں تھکن سے بوجھل ہوئے جاتے ہیں،

اب مجھ سے تو ، چلا نہیں جاتا

ابا ـــ کہاں لئے جاتے ہو ،

ٹھہرو ـــ

اکبر ۔ یہ تو جاگ اُٹھا ہے ، جلدی کرو نا

جمیل ۔ یہ کیسی جگہ ہے ؟

اندھیرا ـــ ، جانے کہاں ہوں ؟

چاروں جانب کیسا شور ہے ،

اکبر ۔ بیٹا ، جمیل

گھبراؤ نہیں ، ـــ دیکھو میں

دیکھو تمہارے پاس میں ہوں ،

جمیل ۔ کون ہو تم ؟ یہاں مجھے کیوں لائے ہو ؟

اکبر : میں تمہارا باپ ہوں ،
تم رستے میں تھک کر گر گئے تھے نا
اسی لئے میں تمہیں یہاں لے آیا ہوں ،
اس جھونپڑی میں ،
دریا کے کنارے ،
کہو طبیعت بہتر ہے ؟

جمیل : کیا میں تھک کے گرا تھا ؟
کوئی بھاری ہاتھ ——————— بہت بھاری
میرے سر پر زور سے آن لگا تھا ،

کس کا ہاتھ تھا ؟

نہیں ، نہیں ، تم نے مجھ کو مارا تھا
میں گھر کو جانا چاہتا ہوں ،

اکبر : ابھی چلیں گے بیٹا ،
تم کمزور ہو ، تھکے ہوئے ہو ،
تمہیں اٹھا کے لے چلتا ہوں ،

جمیل : نہیں ، نہیں ، میں خود
چل سکتا ہوں ،
تم میرے پاس نہ آؤ
امی ٹھیک ہی کہتی تھی —— تم پاگل ہو ،

تم وحشی ،
رستے میں بھی کتنے عجیب دکھائی دیتے تھے ،
وحشی آنکھیں جلتے ہوئے انگارے
اور غصے میں بھنچے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کے
میں تو ڈر ہی گیا تھا ،
اب میں اکیلا ہی جاؤں گا
تم چاہو ، تو ابا ، بعد میں آتے رہنا ،

اکبر : نہیں ، نہیں ، مت جاؤ ،
تم کمزور ہو ، تھکے ہوئے ہو
اور پھر شہر بھی دور ہے ،

جمیل : مجھ کو رستہ اچھی طرح یاد ہے
جس جانب دریا مڑتا ہے
اس پہ دوسری جانب شہر کی راہ ہے

اکبر : رستہ بڑا اندھیرا ہے ٹھہرو میں بھی چلتا ہوں

جمیل : کھیتوں سے ہوتا ہوا رستہ
بڑی سڑک سے جا ملتا ہے
اس سے آگے بڑی سڑک کی روشنیاں ،
اس سے آگے شہر ہے
روشنیاں ہی روشنیاں

اکبر : ٹھہرو ، ٹھہرو ، مت جاؤ ،

تم میرے ساتھ رہو گے ،

جمیل : نہیں نہیں

عبداللہ : اسے نہ روکو ، جانے دو

یہ اب کبھی تمہارے ساتھ نہیں جائے گا ،

اس کی راہ الگ ہے ،

اکبر : نہیں ، نہیں

میری اس کی راہ علیحدہ کبھی نہ ہوگی

میں نے سب کچھ اس کے لئے کیا ہے ،

اس کے سوا میرے جینے کا مقصد کیا ہے ؟

عبداللہ : اب جینے کا مقصد

اس کے سوا تو کچھ بھی نہیں ہے ،

جینا ہے

دن اور رات ،

دھوپ اور چھاؤں ،

پانی ریت اور مٹی جو بھی کچھ ہے جینا ہے ،

اب تو اسی اک پل کے لئے زندہ رہنا ہے ،

میرےساتھ اگرچلنا ہے، سب کچھ چھوڑنا ہوگا

یاد نہیں ہے

تم نے اپنے ابا ـــــ کی خواہش کو

ٹھکرایا تھا

اور آج تمہارا بیٹا بھی تو
تمہاری خواہش کو ٹھکراتا ہے ،
اکبر : جمیل ، یہ کیسے ہو سکتا ہے !
مجھے یہاں پر چھوڑ کے کیسے جا سکتے ہو ؟
میرے بیٹے ، جمیل
میری آنکھوں میں جھانکو تو ، ــــ مت جاؤ
جمیل : مجھے تمہاری آنکھوں سے ڈر آتا ہے ،
مجھے تمہارے ارادے پر شک ہے
کیا معلوم کہاں لے جانا چاہتے ہو ،
میں ہر گز چلنے کے لیے تیار نہیں ،
عبداللہ : سنو ، سنو ، وہ آوازیں ،
نزدیک آتی جاتی ہیں ،
روشنیاں اس سمت بڑھی آتی ہیں ،
تم اب جس کی خاطر رکے ہو
وہ تو کبھی تمہارے ساتھ نہیں جائے گا ،
مجھے بتاؤ ــــ چلنا ہے ،
تم اب اپنی جان بچاؤ ،
اکبر : یہ بھی میری طرح کیا در در ٹھوکر کھائے گا
شہر اور شہر کے زہر آلود
ہوا میں ٹوٹے ہوئے شیشے کی مانند اڑے گا ،

لاکھوں دہلیزوں پر رکے گا ،
کہیں بھی راہ نہیں پائے گا ،
رستوں پر بکھرے گا ،
راہ نہیں پائے گا ،
میرے لیے اب کوئی راہ نہیں ہے

عبداللہ : یہاں سے آگے دو رستے ہیں ،
یا تو اس کی خاطر آنے والی سخت رتوں کے
کانٹے ہیں
اس کو کہاں کہاں تم لئے پھروگے ؟
ہمیشہ شہر کی خواہش
تم سے علیحدہ رکھے گی ، بے چین کرے گی
ساتھ بھی ہوتے ہوئے تمہارے ساتھ نہ ہوگا
اس کا رشتہ شہر سے بندھا ہوا ہے
تم اس ڈور کو کاٹ نہیں سکتے ،
کاٹوگے تو ساری عمر
تم سے نفرت کرتا رہے گا
دوسرا رستہ تمہارا اپنا ہے
آزادی کا رستہ
سارے رشتے ، سارے ناطے
توڑو تو آزاد ہو

اُس کا درد تمہارا درد نہ ہوگا
اُس کے سکھ میں تمہارا سکھ بھی نہ شامل ہوگا
—— سنو ، سنو ، دریا کی آواز سنو
اب دریا کا رستہ تمہارا رستہ ہے
ایک تمہاری آزادی کا پل زندہ ہے
باقی کچھ بھی نہیں ہے

(جمیل چلا جاتا ہے)

اکبر : میرا بیٹا جمیل
عبداللہ : اب پیچھے مڑ کر مت دیکھو
ساری پچھلی زندگی بھی اس پل میں ہے
آنے والے جنم بھی اسی پل میں ہیں
یہ پل لاکھوں برسوں کی
خاموشی میں پھیل گیا ہے
سب کچھ اُس کی قید میں ہے
موج موج میں بہتا ہے
پانی بن کر آتا ہے ، جاتا ہے ،
پھر بھی زندہ رہتا ہے
اول سے لے کر آخر تک
موجوں کی زنجیر ہے جس میں

میں اور تم ، سبھی جکڑے ہوئے ہیں
جس کا کوئی آغاز نہیں ہے
کوئی انت نہیں ہے
اس دریا سے کوئی راہ نہیں ہے ، — بولو
کونسا رستہ ہے ؟

اکبر : کیا وہ چلا گیا ہے ؟
کیا وہ چلا گیا ہے ، — میرا بیٹا
وہ بھی میری طرح کیا
در در ٹھوکریں کھائے گا
شہر اور شہر کی زہر آلود ہوا میں
ٹوٹے ہوئے پتے کی مانند
اُڑے گا
شام کی اُڑتی دھول کا نقش لئے ماتھے پر
لاکھوں دھلیزوں پہ رکے گا

عبداللہ : سنو ، سنو ، وہ آوازیں
بھاری قدموں کی آوازیں
روشنیاں اور سائے

دیکھو باہر کے یہ سائے
اس جانب بڑھتے آتے ہیں
آؤ چلیں

تمہارے لئے اب یہاں ٹھہرنا اور ٹھیک نہیں ہے

اکبر - میرا رستہ اُس سے جدا تھا

مجھے کبھی معلوم نہیں تھا

عبداللہ - آؤ چلیں

ہم کو دریا اپنی سمت بلاتا ہے

دریا —— دریا

اپنی گود پھیلا

ہم آتے ہیں

ہم آتے ہیں

لہرو ، لہرو ——

ٹھہرو ٹھہرو

ہم آتے ہیں !

۲۸۔

افتخار جالب کی نظموں کا پہلا مجموعہ

ماخذ

یہ نظمیں آج کل کے شاعرانہ طرز فکر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان کا شاعر آج اور کل کی نئی اقدار کا مفہوم متعین کرتا ہے اور فکری لحاظ سے اردو شاعری کو نیا انداز اور زبان کو نئے معنی بخشتا ہے ۔

(زیر طبع)

مکتبہ ادب جدید
چوک بل روڈ ۔ لاهور

لائن پریس ۔ لاهور